© rasailojaraid.com

پروفیسر خالد شبیر احمد　　　　قسط: ۴۵

ورق ورق زندگی

فیصل آباد میں قیام (۱۹۷۳ء-۱۹۹۷ء) علمی وادبی سرگرمیاں:

زندگی کا اکثر حصہ فیصل آباد میں ہی گزرا۔ ۱۹۷۳ء میں جب میں بہاول پور سے تبدیل ہو کر یہاں گورنمنٹ کالج میں آیا اور یہاں پر میں نے ۱۹۹۷ء تک قیام کیا، خصوصی طور پر میری زندگی کا اس لحاظ سے انتہائی اہم عرصہ ہے کہ اس میں مجھے ایم۔اے۔اسلامیات کی کلاس کو بھی بارہ سال تک پڑھانے کا موقع ملا جو ایک اہم اور خوش گوار تجربہ تھا۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اگر مجھے ایم۔اے۔ کی جماعت کو پڑھانے کا موقع نہ ملتا تو بطور استاد ایک اہم تجربے اور مشاہدے سے محروم رہتا۔ کیونکہ ایک استاد کے ذہن میں جس طرح کے شاگردوں کی طلب فطری طور پر ہوتی ہے وہ مجھے اس ایم۔اے کی کلاس میں ملی۔ اگرچہ مجھے فسٹ ایئر سے لے کر بی۔اے تک کی کلاسوں کو پڑھانے کا موقع پہلے ہی مل چکا تھا۔لیکن ایم اے کی کلاس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ نظم وضبط، کلاس میں پڑھانے کے لئے وافر وقت۔ شاگردوں کی اطاعت اور ان کی تعلیم کی طرف توجہ اور پھر سب سے بڑھ کر استاد کا احترام اس درجۂ تعلیم میں استاد کی مرضی کے مطابق ملا۔ پروفیسر افتخار چشتی مرحوم جو پہلے میرے اسلامیات کے استاد تھے اور جب میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں بطور پروفیسر آیا تو اس وقت بھی وہ پڑھا رہے تھے۔ اس لحاظ سے وہ اس کالج میں میرے ہم کار بھی ٹھہرے، وہ صدر شعبہ اسلامیات بھی تھے۔ انھوں نے ہی پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اسلامیات کے لیے اجازت لی، اجازت تو انھیں مل گئی لیکن یونیورسٹی نے انھیں کہا کہ اسلامیات پڑھانے کے لئے سٹاف کا انتظام آپ نے خود کرنا ہے۔ اس دن میں بڑا حیران بھی ہوا اور پریشان بھی، جب انھوں نے مجھے بلا کر کہا کہ خالد شبیر، اسلام کے سیاسی ومعاشرتی نظام کا پرچہ جو ایم اے کے نصاب میں شامل ہے وہ تم نے پڑھانا ہے۔ میں نے انکار کیا کہ سر میں نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا کہ ایم۔اے کی کلاس کو پڑھاؤں گا، میں تو اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ کہنے لگے دیکھو تم میرے شاگرد بھی ہو اور اب اس کالج میں میرے ہم کار بھی ہو، میں نے پورے شہر میں اس مضمون کے لیے غور کیا کہ کسے اس مضمون کے پڑھانے کے لیے کہوں، مگر مجھے تم سے بہتر کوئی دوسرا نہیں مل سکا۔ میں تمھارے مزاج، تمھارے خیالات، تمھاری افتادِ طبع سے پوری طرح آشنا ہوں اور پھر میں تمھارے لیکچرز بھی چھپ چھپ کر سن چکا ہوں۔ تم اس مضمون کو پڑھانے کے لیے ہر لحاظ سے اہل ہو۔ لہٰذا یہ میرا حکم ہے اور اسے تمھیں بجالانا ہے، اس لئے بھی کہ تمھارے میرے درمیان استاد شاگرد کا رشتہ ہے اور یہ حکم اسی حوالے سے تمھیں دے رہا ہوں۔ اب میرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے کوئی بہانہ نہ تھا کہ میں انکار کرسکوں۔ پہلے سال تو مجھے کافی محنت کرنا پڑی، رات کو ایک بجے تک مطالعہ کیا کرتا اور ساتھ ہی اپنی آسانی کے لیے اہم نکات بھی لکھ لیتا کہ بیان کرنے سے رہ نہ جائیں، پہلے سال مطالعہ کرنا پڑا، کتابیں کچھ تو پہلے ہی میرے پاس تھیں کچھ خرید لیں اور پھر میں نے جو پڑھانا شروع کیا تو انتہائی کامیابی کے ساتھ پڑھایا۔ ہر سال میرا رزلٹ بڑا ہی اچھا آتا۔ اس تجربے سے میں بہت محظوظ ہوا اور ہر لحاظ سے کامیاب بھی، میں خوش اور مطمئن تھا کہ میرے استاد محترم جناب پروفیسر افتخار چشتی نے جو فرمایا تھا وہ کس قدر درست تھا اور ان کا میرے بارے تجزیہ بھی صحیح رہا۔

ادبی سرگرمیاں:

پھر اس عرصۂ قیام میں مجھے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع بھی ملا۔ ملتان میں تھا تو ہاکی کھیلنے کے بعد میں اور عابد صدیق مرحوم گلڈ ہوٹل میں ادبی تنظیم ''رائٹرز گلڈ'' کے اجلاسوں میں ہر ہفتے شریک ہوتے۔ یہاں فیصل آباد آیا تو محفل ہوٹل میں بیٹھنا شروع کیا۔ اس ہوٹل میں ''حلقۂ ارباب ذوق'' کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے، اس وقت پروفیسر انور محمود خالد حلقے کے سیکریٹری تھے وہ میرے ہی کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ اس حلقے کے اجلاس میں شرکت شروع کردی، ان سے پوچھا کہ حلقۂ ارباب ذوق کا رکن بننے کے لیے کیا شرط ہے؟ کہنے لگے دو تین مضمون کسی بھی عنوان سے لکھ کر یہاں پڑھو تو رکن بنا لیے جاؤ گے۔ میں نے اقبال پر چند مضمون لکھے اور حلقے میں پڑھے تو رکن بن گیا پھر تسلسل کے ساتھ حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں شریک ہوتا رہا۔ شہر کے اہم ادیبوں اور شاعروں سے متعارف ہوا، یہی تعارف بعد میں ان کے ساتھ خوش گوار تعلق کا باعث بھی بنا۔ ادب سے لگاؤ تو مجھے فطراً تھا، ہاکی کے ساتھ شدت سے وابستگی اس پر حاوی رہی، اس شدت کا احساس اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ میں نے گرمی کے رمضان شریف میں بھی روزہ رکھ کر دو دو گھنٹے ہاکی بلا ناغہ کھیلی، نہ روزے چھوڑے اور نہ ہی ہاکی کھیلنا چھوڑی اور جب ہاکی کو خیر باد کہا تو پھر ادبی سرگرمیوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کرلیا، لکھنے کی مشق تو مجھے حضرت سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے ہی ہوگئی تھی۔ وہی مجھے کچھ نہ کچھ لکھنے کی تلقین کرتے رہتے تھے اور میں ان کے حکم کی تعمیل میں لکھتا رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ شورش کاشمیری ملتان تشریف لائے تو مجلس احرارِ اسلام کی طرف سے سپاس نامہ لکھنے کے لیے مجھے ہی ان کی طرف سے کہا گیا تو میں نے وہ سپاس نامہ لکھا جسے پڑھ کر ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے خوب داد دی۔ کہنے لگے کہ تم نے تو کمال کردیا ہے کہ اس سپاس نامے میں جو الفاظ تم نے چنے ہیں وہ تمام شورش کاشمیری کی نثر میں عموماً استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے شورش کے طرز تحریر کو سامنے رکھ کر یہ سپاس نامہ لکھا ہے۔ دو تین برسوں میں ہی میں مشہور ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ دوستی کے رشتے میں ڈھل گیا اور میرے ادبی ذوق وشوق میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاعری کی طرف:

سروس سے ریٹائر ہونے سے دو سال پہلے یعنی ۱۹۹۲ء میں شعر کہنے شروع کیے تو دوستوں میں اچھا خاصا چرچا ہوا۔ کالج کی ٹی کلب ہو یا پھر شام کو محفل ہوٹل دونوں جگہوں پر دوستوں کے درمیان میری شاعری پر ہی بحث ہونی شروع ہوگئی، بلکہ دوست دو حصوں میں تقسیم ہوگئے کچھ نے کہا کہ خالد شبیر کو شاعری کرنی چاہیے کچھ کہتے کہ نہیں کرنی چاہیے یہ نثر نگار ہی رہے تو اچھا ہے۔ شاعری کی کوشش کہیں اس کی نثر نگاری کو ہی نہ لے بیٹھے۔ اس وقت تک میں ''تاریخ محاسبہ قادیانیت'' جیسی اہم کتاب لکھ چکا تھا جو بڑے بڑے اہم نثر نگاروں نے پسند کی۔ شہر کے اہم نثر نگار اس کتاب کے معترف تھے اور انھوں نے اس کتاب پر بڑے اہم لکھ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جو دوست میری ابتدائی غزلوں سے مطمئن نہ تھے انھوں نے میری شاعری کی مخالفت کی۔ لیکن کچھ ایسے دوست بھی تھے جو یہ کہتے تھے کہ خالد شبیر کو شاعری کرتے رہنا چاہیے۔ چودھری صفدر علی ایڈووکیٹ جو ہمارے محفل ہوٹل کی محفلوں میں میرِ محفل کی حیثیت رکھتے تھے انھوں نے اس تکرار سے تنگ آ کر ایک بورڈ بنا دیا۔ اور مجھے کہا گیا کہ تم اس بورڈ جس کے اراکین ڈاکٹر ریاض مجید، پروفیسر عارف رضا اور ملک اکرام محی الدین تھے کے سامنے اپنی اب تک کہی ہوئی غزلیں پیش کرو اور اب یہ بورڈ فیصلہ کرے گا کہ تمھیں شاعر کرنی چاہیے کہ نہیں۔ ایک دن مقرر ہوگیا اور پروفیسر عارف رضا صاحب کے گھر گلستان کالونی میں تمام دوستوں کو اکٹھا کیا گیا۔ میں نے اپنی غزلیں بورڈ کو پیش کر دیں انھوں نے غزلیں پڑھیں اور پھر ان غزلوں کے بارے میں مجھ سے کچھ سوالات کیے جس کے بعد انھوں نے چودھری صفدر علی ایڈووکیٹ کے سامنے لکھ کر اپنا فیصلہ پیش کیا کہ:

''خالد شبیر کو شاعری کرتے رہنا چاہیے بشرطیکہ اس کی غزلوں کی اصلاح ڈاکٹر ریاض مجید کریں، جس کی حامی ڈاکٹر صاحب نے بھر لی ہے چنانچہ خالد شبیر کو شاعری کرنے کی اجازت ہے، اس کے بعد دوستوں میں اس موضوع پر گفتگو ممنوع قرار دی جاتی ہے۔''

حلقۂ ارباب ذوق میں پہلی غزل:

فیصلہ میری شاعری کے حق میں ہوگیا تو پھر میں نے پہلی دفعہ اپنی غزل حلقۂ ارباب ذوق میں تنقید کے لئے رکھی تو ناقدین نے میری اس غزل کے یوں لتے لیے کہ میں شرم کے مارے ایک عجیب وغریب کیفیت میں ڈوب گیا۔ اراکین مجلس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت کو شاعری کی ابتدائی معلومات سے بھی واقفیت نہیں۔ خصوصاً ایک نوجوان ناقد شاہد اشرف جو اب ڈاکٹر شاہد اشرف ہیں انھوں نے خاص طور پر بڑی سخت تنقید کے تیر میری غزل پر برسائے جس سے میرے دل و دماغ شدید زخمی ہوئے اور میں سوچ میں غرق اپنے آپ سے پوچھنے لگ گیا کہ تو اچھا بھلا تھا یہ تو نے کیا جرم کر دیا کہ بھری مجلس میں تیرے شعور وشوق کو رسوا ہونا پڑا ہے، اب بھی وقت ہے کہ تو غزل گوئی سے توبہ کرلے اور اس کام سے جان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھڑا لے۔ لیکن یہ کیفیت چند لمحوں کے لئے تھی اور پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ احراری ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے اسے چھوڑ دینا تمہاری ہی نہیں احرار کی بھی توہین ہے۔ اس لیے میں نے اس کیفیت سے باہر نکل کر عہد کیا کہ اب میں انھیں شاعری کر کے دکھاؤں گا۔ اجلاس ختم ہوا تو ہم تھری سٹار ہوٹل سے باہر بازار میں آئے تو میں نے شاہد اشرف کو ایک دکان سے کوکا کولا کی بوتل پلائی اور اسے تھپکی دے کر کہا کہ میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج میری غزل پر تمھاری شدید تنقید نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اب میں شاعری کروں گا اور ایک دن میں تمھیں اپنی شاعری کی ایسے ہی تعریف کرنے پر مجبور کر دوں گا جس طرح تو نے آج تنقید بھی کی اور مجھے شاعری چھوڑنے تلقین بھی کی۔

چنانچہ ایک دو ماہ کے بعد میں نے دوسری دفعہ غزل حلقۂ ارباب ذوق میں پیش کی تو تنقید تو ہوئی مگر اتنی نہیں جتنی پہلی غزل پر ہوئی تھی، قدرے حوصلہ ہوا اور دو تین ماہ بعد حلقہ میں تیسری دفعہ غزل پیش کی۔ میں نے غزل پڑھی حاضرین مجلس نے غزل سنی۔ ہر ایک کے ہاتھ میں میری غزل لکھی ہوئی صورت میں موجود تھی، صدر مجلس نے تنقید کے لیے کہا تو جواب میں خاموشی تھی۔ پھر خاص طور پر صدر صاحب نے شاہد اشرف کو جو میری دوسری غزل پر حسبِ معمول تنقید کرتے نظر آئے تھے انھیں مخاطب کرتے ہوئے بولے: ''شاہد اشرف خالد شبیر کی غزل پر آپ بھی خاموش ہیں کچھ تو کہئے شاہد اشرف کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ آج میں خالد شبیر کی اس غزل سے انتہائی متاثر ہوا ہوں اور میں حیران ہوں کہ اتنی جلدی غزل گوئی میں یہ اس قدر آگے بڑھے ہیں کہ اس پر انھیں داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا، اس غزل میں مجھے اقبال کا رنگ ڈھنگ اور کئی بڑے شعرا کی خوبو میرے ذوق وشوق کی تسکین وفرحت کا باعث بنتی نظر آئی ہے۔ اسلوب بھی منفرد ہے، زبان وبیان کی خوبی بھی ہے اور خیال وتخیل بھی خوب ہے غرضیکہ ہر لحاظ سے مکمل اور قابل تعریف ہے۔ دوسرے چند شرکا نے بھی تعریفی کلمات سے غزل کو سراہا تو میرے دل میں بھی یہ احساس پیدا ہوا کہ عزم اور محنت سے ہر منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس غزل کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

کسی کا درد جو شامل میرے نصاب میں ہے
ہر اک سانس میرا مستقل عذاب میں ہے

ہے سوزِ برق محبت کی جلوہ آرائی
کہ تیرے حسن کا پرتَو میرے شباب میں ہے

نویدِ خلد سکینت ابھی نصیب کہاں
ابھی دلوں کا سفر دشتِ اضطراب میں ہے

مثالِ برگ ہے آوارہ فکرِ انسانی!
متاعِ فکر و نظر حلقۂ سراب میں ہے

اسی لیے تو ہے جذبوں سے زندگی خالی
کہ برقِ عشق ابھی عقل کے لحات میں ہے

ابھی تو موسمِ گل پر خزاں کے سائے ہیں
جہانِ رنگ ابھی نرغۂ عتاب میں ہے

میرا ہی رنگ ہے سارے نظامِ گلشن میں
لہو مرا ہی ہر اک ریشۂ گلاب میں ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کس کے نام کروں دولتِ سخن خالد　　تیرے سوا بھی کوئی چشمِ انتخاب میں ہے؟

مجلس اقبال کی سیکریٹری شپ:

شہر میں مجلس اقبال بڑی فعال تھی، ہر سال یومِ اقبال بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا تھا۔ ادیب، شاعر، پروفیسر اور ایڈووکیٹ حضرات کی ایک کثیر تعداد یومِ اقبال میں شرکت کیا کرتی تھی۔ پروفیسر مرزا منور عموماً مہمانِ خصوصی ہوتے اور اپنے گراں قدر خیالات اقبال کے حوالے سے سامعین کے سامنے پیش کرتے۔ پروفیسر عارف رضا مجلس اقبال کے سیکریٹری اور میرے استاد پروفیسر افتخار چشتی مجلس اقبال کے صدر تھے۔ مجھے اس کے ماہانہ اجلاسوں میں شرکت کا موقع ملتا تو میں بھی اقبال کے تصوّرِ ملت یا پھر اقبال فکری محاذ پر'' کے عنوانات کے تحت کچھ نہ کچھ بیان کر دیتا۔ آہستہ آہستہ مجلس اقبال کے اربابِ بست وکشاد نے اقبال کے بارے میں میرے خیالات سے متاثر ہو کر مجھے اہمیت دینی شروع کر دی تو ایک نئے انتخاب میں مجلس اقبال فیصل آباد کی سیکریٹری شپ کے لئے مجھے چن لیا گیا اور صدارت کے لئے چوہدری صفدر علی ایڈووکیٹ کو، اس طرح اب مجلس اقبال کو متحرک رکھنے کی ذمہ داری ہم دونوں پر ڈال دی گئی۔ تقریباً چھ سال تک ہم دونوں نے مجلس اقبال کے ماہانہ اجلاس بھی ایک تسلسل کے ساتھ جاری رکھے اور سالانہ اجتماع یومِ اقبال بھی اپریل کے مہینے میں مناتے رہے۔ پروفیسر افتخار چشتی، مولانا مجاہد الحسینی، اقبال فیروز، ان کے چھوٹے بھائی افتخار فیروز، ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر ریاض مجید، ملک اکرام محی الدین، حافظ لدھیانوی، پروفیسر غلام حیدر چشتی، ڈاکٹر اسحاق قریشی، شیخ بشیر، قاری اکبر صاحب اور ان تمام اہم حضرات کا تعاون اس سلسلے میں میری ہر کوشش اور کاوش کو کامیابی سے ہمکنار کرتا رہا۔

یوم امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ:

یومِ اقبال کے ساتھ ہم نے اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے اگست میں یومِ امیر شریعت کی تقریب کا بھی اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ اسی جذبے اسی جوش وخروش کے ساتھ ہم انھی احباب جن کا ذکر اوپر ہوا ہے کے تعاون سے یومِ امیر شریعت کچہری بازار کے باہر ڈسٹرکٹ کونسل ہال جسے جناح ہال بھی کہا جاتا ہے میں مناتے رہے۔ اس اجلاس کی نقابت میں خود کرتا تھا۔ یوم امیر شریعت کے مہمان خصوصی ایک دفعہ ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا گیا تو ایک دفعہ ابن امیر شریعت سید عطاء المومن بخاری صاحب کو بھی، جنھوں نے چودھری صفدر علی ایڈووکیٹ کی صدارت میں رات ایک بجے تک جناح ہال میں تقریر کی پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ امیر شریعت کی زندگی کے مختلف پہلو، ان کی دینی خدمات ان کی حریت پسندی، ان کے عزم وہمت، ان کی عزت وتہور کا تذکرہ اور پھر خطابت سید عطاء المحسن بخاری، سید عطاء المومن بخاری کی، لوگ محوِ حیرت ان کی تقریر میں گم نظر آتے تھے۔

مقامی جماعتوں سے اہم لوگوں کو بھی بلایا جاتا اور ہر مسلک اور ہر جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات یوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امیر شریعت میں شرکت کرتے، اپنے خیالات سے لوگوں کو مستفیض فرماتے اور امیر شریعت کی شخصیت کو نئی نسل سے متعارف کراتے، یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا اور شہر کے لوگوں نے اس میں پورا پورا تعاون کیا۔

مجلس معین ادب کی صدارت:

شہر کی ادبی تنظیم مجلس معینِ ادب جو شہر کے معرف شاعر جناب آصف بشیر چشتی کی سرپرستی میں بڑی کامیابی کے ساتھ ادبی و علمی تقریبات کا اہتمام کرتی تھی، اس سے بھی تعلق قائم ہوا۔ میں ان دنوں مدن پورہ میں گلستان کالونی منتقل ہوگیا تھا اور یہ ادارہ اسلامیہ پارک میں تھا جو میرے گھر کے قریب تھا۔ اکثر میں آصف بشیر چشتی کے پاس آجاتا تھا۔ وہ اپنے والد محترم کے مزار پر اکثر مسجد کے پاس بیٹھتے اور شہر کے ادیب و شاعر عموماً ان کے ہاں جمع رہتے تھے۔ انتہائی ملنسار، خدمت گزار اور دھیمے مزاج کے انسان تھے۔ جو ایک بار مل لیتا اسے بار بار ملنے کی خواہش چین نہ لینے دیتی، میں ان کی محفل میں اکثر شرکت کرتا۔ وہ ہر ماہ ایک مشاعرہ کراتے، جس میں بطور شاعر میں بھی غزل سرا ہوتا، شہر کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر اُن کی ادبی محفلوں میں شرکت کرنا اپنے لئے اعزاز کا باعث سمجھتے۔ ڈاکٹر اسحاق قریشی اور پروفیسر ڈاکٹر ریاض اکثر ان تقریبات کی صدارت کرتے۔ افضل خاکسار، عارف رضا، سکندر ایاز، حافظ لدھیانوی، کوثر علی، کامران رشید، پروفیسر شفقت حسین شفقت اور حکیم رمضان، ڈاکٹر جاوید باتش، مقصود وفا اور دوسرے کئی اہم شاعر و ادیب جن کے نام اب ذہن سے محو ہو چکے ان ادبی محفلوں میں شریک ہوتے۔

پیر آصف بشیر چشتی مجھ پر ایسے مہربان ہوئے کہ انھوں نے مجھے مجلس معینِ ادب کا صدر بنا دیا۔ چنانچہ ان کی سالانہ تقریبات کا سارا انتظام میری نگرانی میں ہوتا تھا۔ سالانہ مشاعرے بڑے اہتمام سے کرائے جاتے، ایک دفعہ میں نے ڈاکٹر اسلم انصاری کو ان تقریبات میں شمولیت کی زحمت بطور مہمان خصوصی دی، وہ تشریف لائے اور ایک دو مرتبہ میرے عزیز دوست پرفیسر عابد صدیق مرحوم بھی ان سالانہ تقریبات بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے اور محفل کو چار چاند لگا دیے۔ یہ سلسلہ آصف بشیر چشتی کی زندگی تک جاری رہا۔ ۱۹۹۷ء میں، میں جب فیصل آباد سے چنیوٹ آگیا تو پھر بھی مجلس معینِ ادب کے ساتھ میرا تعلق قائم رہا۔ ان کے سالانہ نعتیہ مشاعروں میں میری شرکت ہوتی رہی، انھوں ایک کتاب بھی مرتب کی جس میں فیصل آباد ڈویژن کے شعراء کا نعتیہ کلام شامل کیا گیا۔ کتاب کا نام ''شہرِ نعت'' تجویز ہوا اور اسی نام سے کتاب منصۂ شہود پر آئی۔ انھوں نے فیصل آباد شہر میں نعت گوئی کے فن کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ یہ ان کی فنی دسترس کا کمال ہے کہ اب انھی کی تربیت سے کئی شعراء صرف نعت گوئی کے اعزاز سے شہر اور گردونواح میں منفرد مقام حاصل کر چکے ہیں۔ پیر آصف بشیر چشتی کی وفات پر میں نے ایک نظم بھی کہی جس کے چند شعر اس طرح تھے:

ہم سے بچھڑ کے کھو گیا آصف بشیر بھی　　ملکِ عدم کا ہوگیا آصف بشیر بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے خیال و فکر میں قوسِ قزح کے رنگ
طرزِ بیاں میں اس کی تھی ہاں فقر کی ترنگ

تھا دل نشیں کتابِ ادب کا وہ زرّیں باب
ہر حرف بے مثال تو ہر بات لا جواب

شبنم سا اس کا لہجہ تھا حرف اس کے باوضو
اُس داستانِ شوق کا چرچا ہے چار سُو

خالدؔ کہوں میں کیا کہ وہ کامل نظر بھی تھا
دنیائے آگہی کا وہ شمس و قمر بھی تھا

خواب خواب روشنی:

یہ ادبی و عملی سرگرمیوں کا ماحول میرے لئے میری ادبی تربیت کا ایسا ذریعہ بن گیا کہ میں نے ۱۹۹۲ء میں شعر کہنا شروع کیا ۱۹۹۵ء میں غزلوں کا ایک مجموعہ ’’خواب خواب روشنی‘‘ کے نام سے منصۂ شہود پر آ گیا۔ کتاب کی رونمائی کی پہلی تقریب گورنمنٹ کالج کے ہال میں ہوئی جس میں سید ذوالکفل بخاری شہید رحمۃ اللہ علیہ مہمان خصوصی تھے اور پروفیسر تاثیر وجدان مرحوم کی صدارت تھی۔ دوسری تقریب زکریا یونیورسٹی ملتان میں ہوئی اور تیسری تقریب مجلس ادب جڑانوالہ کے زیر اہتمام جڑانوالہ میں منعقد ہوئی جس میں ادیبوں اور شاعروں نے کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کتاب کو سراہا گیا۔ ’’خواب خواب روشنی‘‘ پر ڈاکٹر اسلم انصاری، پروفیسر عارف رضا، ڈاکٹر شبیر قادری کے تاثرات کتاب کا حصہ ہیں۔

ملک کے معروف نعت گو شاعر جناب حافظ لدھیانوی مرحوم و مغفور نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کئے:

’’دو تین سال کی قلیل مدت میں اتنا شعری مجموعہ فراہم کرنا کہ دیوان مرتب ہو جائے حیران کن بھی ہے اور مسرت افزا بھی، یہ لگن، ذوق اور مسلسل ریاضت کا ثمرہ ہے۔ پروفیسر خالد شبیر کو تعلیمی اور تدریسی ادارے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے صاحب علم اور قادر الکلام شعراء کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے مواقع میسر آتے رہے، جن سے ان کے شعری جوہر کو جلا ملتی رہی اور ان کا فطری ذوق شعر و آہنگ ڈھل گیا، ان کا فن مستقل ارتقاء پذیر ہے جس کا ثبوت ان کے کلام سے ہمیں ملتا ہے جس میں غزل کا حسن اور فکر کا نیا پن بھی ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب جب کہ وہ اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو چکے ہیں ان کی تمام تر توجہ مطالعے اور اس فنِ لطیف کو مزید جلا دینے اور نکھارنے میں صرف ہو گی اور مستقل قریب میں غزل گو شعراء کی صف میں ایک خوبصورت شاعر کے اضافے کی توقع ہو سکتی ہے۔‘‘

افضل احسن رندھاوا کے تاثرات:

’’درویش اکثر وضع دار اور قلندر لہر میں کج کلاہ کرتا ہے، میرے محترم دوست خالد شبیر ہمہ وقت درویش، وضعدار اور قلندر کج کلاہ ہیں۔ وہ اسے امیر شریعت رئیس الاحرار کی صحبت کا فیض مانتے ہیں۔ اسی نسبت سے یہ وضع دار اور قلندر کج کلاہ اگر تلوار کی کاٹ جیسی زبان اور اچھے تلوار باز جیسی مہارت و روانی گویائی نہ رکھتے تو مجھے حیرت ہوتی۔ تحریر و تقریر کی اس منہ زور طغیانی کو اب وہ نظم کر رہے ہیں۔‘‘

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں:

''خالد شبیر کے مطالعے کا میدان خاص محاسبۂ قادیانیت کی تاریخ کا جائزہ ہے، انھوں نے اس باب میں ''تاریخ محاسبۂ قادیانیت'' ایک گراں قدر کتاب بھی تصنیف کی ہے، جس کے اب تک دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ انھیں قدرت کی طرف سے شعروشاعری کا شوق بھی ودیعت ہوا ہے۔ چونکہ وہ شعرفہمی سے شعرگوئی کی طرف آئے ہیں لہٰذا رموزِ شعر سے باخبر ہی نہیں قرینے سے برتنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں، انھوں نے مختصر وقت میں محنت و محبت کے ساتھ اپنا شعری دیوان مکمل کیا ہے۔ شعرگوئی اور شعر کو سنوار نکھار کر پیش کرنے میں ان کی محنت قابلِ ستائش ہے، اس مجموعے کے ساتھ ان کے دو اور شعری مجموعے (غزل اور نعت و منقبت) زیرِ ترتیب ہیں۔ ان کی اشاعت پر خالد شبیر کے شعری قد و قامت کا بخوبی اندازہ ہوگا۔ بقول کسے: ''نقش اوّل بہتر کشد ز اوّل'' مگر ان کا یہ مجموعہ ہی ان کی جملہ شعری خوبیوں اور محاسن کے سبب انھیں اپنے معاصر شاعروں کی صف میں ایک نمایاں مقام کا حامل قرار دیتا ہے۔ ان کی شاعری کی جڑیں کلاسیکی روایت کی زمین سے پھوٹی ہیں لہٰذا ان کے ہاں جدت کا اظہار بھی اپنے اندر کلاسیکی شائستگی اور تسلسل روایت کا خوبصورت قرینہ رکھتا ہے۔''

ڈاکٹر اسلم انصاری اپنے دیباچے کے آخری حصے میں میری شاعری پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

''اظہار کا ایک خاص پیرایہ جو کسی قدر بلند آہنگی کی طرف مائل ہے پھر عصرِ حاضر کا عمومی شعور اور بعض بے حد انفرادی خیالات جو جدید امیجری کے ذریعے بیان ہوئے ہیں ان کی شاعری کا رنگ خاص متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مجموعی شعری آہنگ کے اعتبار سے وہ اس شعری روایت سے خاص طور پر اثر پذیر دکھائی دیتے ہیں جس کی تعمیر و تشکیل مولانا ظفر علی خان نے کی اور جسے ایک طویل عرصے تک آغا شورش کاشمیری اور ان کے ہم سخن شعراء نے زندہ رکھا۔ لیکن خالد شبیر احمد نے اس روایت کے صرف انھیں اجزا کو قبول کیا ہے جن کو جدید رویوں کے ساتھ بہ حُسن و خوبی ہم آہنگ کیا جا سکے۔ یعنی اس روایت کو انھوں نے صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ آگے بھی بڑھایا ہے۔''

(جاری ہے)

© rasailojaraid.com